بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

گزشتہ ترجمان القرآن میں اس دنیا اور اُس کے مال و متاع کے ساتھ ایک مومن و مسلم کے تعلق کی نوعیت کے سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ ایک مسلمان کے نزدیک حقیقی زندگی تو آخرت کی ہے اور وہی اُس کا اصل ٹھکانہ ہے لیکن چونکہ اُس حیات جاودانی کا راستہ اس عارضی زندگی کی آزمائشوں ہی میں سے گزر کر جاتا ہے اس لیے ایک مسلمان اُسے طے کرنے پر مجبور ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دنیا اور اور اُس کے سارے احوال و اسباب عارضی اور ناپائیدار ہیں اور اس بنا پر وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اُن پر تکیہ کیا جاسکے تو پھر وہ کونسے ایسے سہارے ہیں جن کے بل پر ایک مسلمان اپنی حیاتِ مستعار کو گزار سکے۔ یہ سوال انسان کی فطرت کا اوّلین اور بنیادی سوال ہے اس لیے اس کی تاریخ بھی اتنی قدیم اور پرانی ہے جتنی کہ خود انسانیت کی زندگی۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں جس کو اس سوال نے پریشان نہ کیا ہو اور اُس نے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس سوال کا جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں اور نہ ہی تمدن و اجتماع کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ اسی کے ذریعے کفر کو اسلام سے، اطاعت کو بغاوت سے معصیت کو نیکی اور پرہیزگاری سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ اسی سوال کا جواب انسان کا اندازِ فکر اور اسلوب حیات متعین کرتا ہے۔ اس کی نوعیت پر ہی سیرت و کردار کے مختلف ڈھانچے تیار ہوتے ہیں اور افکار و تصورات کی صورت گری ہوتی ہے۔ انسان نے آج تک جتنے فلسفے گھڑے ہیں، جس قدر تہذیبوں کو جنم دیا ہے اور جتنے نظامہائے حیات قائم کیے ہیں ان سب میں یہی ایک سوال بنیاد کے طور پر کام دے رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ معاشرت و معاملات

ہیں، اخلاق و اجتماع میں، سیاست و آئین میں، علم و فلسفہ میں، الغرض حیاتِ انسانی کے سارے مناظر و مظاہر میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی بنیادی سوال کے رُخ زیبا کا عکس ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں فرد یا قوم نے اس سوال کے جواب کا فلاں پہلو اختیار کیا ہے تو ہم اُس کی زندگی کے نقشہ کے تمام خانے از خود بھر سکتے ہیں یا اگر ہم کسی قسم کی زندگی یا تمدن کی خصوصیات پر گہری نظر رکھتے ہیں تو ہم اس امر کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس نے اس سوال کے جواب کا کونسا پہلو اختیار کیا ہے۔

ایک غیر مسلم کے نزدیک چونکہ اصل زندگی یہی آب و گل کی زندگی ہے۔ اور آخرت کی زندگی محض اعتباری چیز ہے اس لیے وہ صرف اسی زندگی کے لیے جیتا ہے اور اسی کو مادی اعتبار سے بہتر اور پُر لطف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادی زندگی کی دلفریبیوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور اسی کو معراجِ انسانیت تصور کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہر وہ چیز بے وقعت ہوتی ہے جو اُس کے تحت میں نہ آسکے یا جس کی تصدیق مجرد حواسِ ظاہری سے نہ ہوتی ہو۔ وہ ہر اسی قوت اور طاقت کا یا تو سرے سے انکار کر دیتا ہے یا اُس کے بارے میں بے یقینی میں مبتلا ہو جاتا ہے جو حواس سے بالاتر ہو اور اگر وہ کبھی کسی بالاتر ہستی کا اقرار بھی کرتا ہے تو اس کا یہ اقرار صرف زبان کی حد تک محدود ہوتا ہے، اُس کے دل و دماغ اور عملی زندگی پر اس ایمان کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے اور اس طرح اُس کی زندگی کے حسی رجحان، اخلاق و اعمال کی حسی بنیاد میں قطعاً کوئی تزلزل واقع نہیں ہوتا۔ وہ صرف لذتِ تمتع کے لیے دنیا میں جیتا ہے اور اسی آرزو میں مرتا ہے۔ ایرانی شاعر نے جس مقصد کو "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کہا ہے وہ اس شخص یا قوم کی غایت الغایات ہوتی ہے۔

جو فرد یا گروہ بھی اپنے دل و دماغ میں اس دنیا اور اس کے مال و متاع کے بارے

میں یہ تصورات رکھتا ہے وہ بالکل فطری طور پر ان مادی اسباب کو اس کائنات کی ہر چیز سے نہ صرف عزیز تر سمجھتا ہے بلکہ انہیں بہت بڑی قوت اور طاقت کا حامل بھی خیال کرتا ہے اور انہیں سہاروں پر زندگی بسر کرنے میں وہ اپنی فلاح و کامرانی کا راز دیکھتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے انہیں مانے یا نہ مانے مگر دنیا کے یہ مادی اسباب ہی حقیقت میں اُس کے معبود ہوتے ہیں۔ اور انہیں کے بل پر وہ زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے متعلق مختلف مقامات پر بحث کی گئی ہے۔ سورۃ شعراء میں قوم عاد کے انداز زیست کا ذکر مندرجۂ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِيۡعٍ اٰيَةً تَعۡبَثُوۡنَ	کیا تم ہر بلند مقام پر بلا ضرورت ایک یادگار عمارت
وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ	بناتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو جیسے کہ
(رکوع ۔ ۷)	تمہیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

اسی طرح رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو جن لوگوں سے اپنی دعوت کے آغاز میں سابقہ پیش آیا اُن میں سے اکثر و بیشتر اسی مادہ پرستانہ تصورِ حیات کے علمبردار تھے، اُن کے افکار و اعمال اخلاق و اجتماع میں حیثیت پوری طرح نمایاں تھی۔ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے کہ اصل اور حقیقی زندگی یہی مادی زندگی ہے، اس کے اسباب ہی زندگی کے سب سے بڑے اور مضبوط سہارے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی ایسی طاقت اور قوت نہیں جو اُن کی زندگی کے اس رشتہ کو کاٹ سکے۔ چنانچہ وہ بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے :۔

وَقَالُوۡا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا	انہوں نے کہا کہ دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں
نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا يُهۡلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهۡرُ	اور زمانہ کے سوا ہم کو کوئی ہلاک کرنے والا نہیں۔

زندگی کے اس طرزِ فکر کے برعکس آئیے اب یہ دیکھیں کہ اسلام ہمیں کس سہارے پر جینے کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام جس طرح ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تم ابنائے دنیا بننے کی بجائے ابنائے آخرت بنو، بالکل اسی طرح اس نے ہمارے ذہن میں اس خیال کو بھی راسخ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم اگر اس دنیا میں جئیں تو صرف اُس ذات کے سہارے جئیں جسے کبھی فنا نہیں، جو ہمیشہ کے لیے رہنے والی ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کی تصریحات جا بجا ملتی ہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ۔ (الفرقان - ۵)

اور تو اس زندہ و جاوید ہستی پر بھروسا کر جسے فنا اور موت نہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (تغابن - ۱۴)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (وہی اکیلا ہی مالک و معبود ہے) اور بس اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو توکل کرنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا فرماتے تھے۔

اللھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت۔ اللھم اعوذ بعزتک لا الہ الا انت ان تضلنی انت الحی الذی لایموت والجن والانس یموتون۔

اے اللہ! میں نے تیرے سامنے سر جھکایا اور تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوا اور میں نے تیرے سہارے پر جھگڑا کیا۔ اے اللہ! میں تیری عزت کی پناہ چاہتا ہوں کہ سوا تیرے کوئی معبود نہیں اس سے کہ تو مجھے بھٹکنے دے۔ تو زندہ ہے نہ مرے گا۔ جن اور انسان سب فانی ہیں۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بڑے بلیغانہ انداز میں اس حقیقت کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں کہ ہمیں اُس ذات پاک کے سہارے زندگی بسر کرنی چاہیے جسے موت نہیں چھو سکتی۔ آخر اس سے زیادہ بیوقوف انسان دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی ہی طرح کی فانی چیزوں پر تکیہ کر کے زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرے۔

توکل کے معاملے میں دوسری چیز جو ہمیں قرآن پاک کے مطالعہ سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ توکل صرف اُسی ذات پر کرنا چاہیے جو سب سے زیادہ قوی، طاقتور اور دنیا کی ہر چیز پر غالب ہے جس کے فیصلے سب فیصلوں پر حاوی ہیں اور جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (آل عمران)

پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکیگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

پھر اسی مضمون کو سورۂ انفال میں اس طرح بیان کیا ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ (رکوع ۸)

اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔

یہود کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر بڑا فخر اور ناز تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قوت اور طاقت کے ان خزانوں کے مالک ہونے کی وجہ سے کوئی اُن کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ اُس کی ذات سے زیادہ علم کس شخص کو حاصل ہے اور اس سے بڑھکر کون قوت و طاقت کا مالک ہے۔ اس لیے تمہیں ان لوگوں کو پرِ کاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دینی

چاہیے اور جو بات سچی ہے اُسے بغیر کسی خوف کے صاف صاف بیان کر دینا چاہیے :

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ فَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَي الْحَقِّ الْمُبِيْنِ - (نمل - ٦)	بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں - اور بیشک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے بیشک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دیگا، اور وہی غالب اور جاننے والا ہے تو خدا پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے

اس کائنات کے خالق اور مالک پر بھروسہ اور اعتماد یوں تو ایمان کی جان ہے اور ایک مسلمان کو اپنی پوری زندگی صرف اسی ایک سہارے پر بسر کرنی چاہیے، لیکن اس توکّل کی حقیقی قدر و قیمت اور اہمیت انسان کو اُس وقت معلوم ہوتی ہے جب اُس کی زندگی پر آ بنے اور مادی اسباب نہ صرف اُس کا ساتھ چھوڑ دیں بلکہ اُس کے جان لیوا بن جائیں۔ یہی وہ حالات ہوتے ہیں جب ایک مسلمان کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ جب قدرت خود دیکھتی ہے کہ اُسے اپنے خالق اور مالک پر کس قدر بھروسہ ہے اور دنیاوی اسباب پر کتنا اعتماد ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا : حَسْبُنَا اللّٰهُ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ہم کو بس اللہ ہی کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ جب مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ گزیں تھے تو مشرکین مکہ ہمارے سروں پر آ گئے۔ میں نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر ان میں کا ایک بھی اپنے قدم کے نیچے دیکھے تو ہم کو دیکھ لیگا - آپ نے بڑے ہی سکون اور اعتماد کے ساتھ فرمایا :

مَا ظَنُّكَ يَا اَبَا بَكْرٍ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ	اے ابوبکر تم ایسے دو کے متعلق کیا گمان کرتے ہو

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا جن کا تیسرا اللہ ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے توکل کے معنی بے عملی کے لیے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اللہ پر اعتماد اور بھروسے کا مطلب یہ ہے کہ اس کارگاہِ حیات میں کسی قسم کی جدوجہد نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی خلوت کدہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دیگا۔ توکل اور بھروسہ کا یہ تصور سراسر غلط اور باطل ہے۔ اسلام میں اس لفظ کے معنی ہیں کہ کسی کام کو پورے ارادہ و عزم، تدبیر اور کوشش کے ساتھ انجام دیا جائے لیکن اس کام کی تکمیل کے معاملہ میں نگاہ اسباب پہ رکھنے کی بجائے مسبب الاسباب پر رکھی جائے کیونکہ دنیا کی ہر چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اس حقیقت کو اب ایک مثال سے سمجھیں۔ جب میں کسی کام کے کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں استعمال کرتا ہوں تو بظاہر میں ان اعضاء سے کام لیتا ہوں لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اعضاء کی کوئی حقیقت نہیں، ان کو سرگرمِ عمل کرنے والی چیز وہ قوت اور طاقت ہے جو میرے اندر موجود ہے۔ چنانچہ جب وہ قوت سلب ہو جاتی ہے تو یہ اعضا موجود ہونے کے باوجود بالکل عبث اور بیکار ہو جاتے ہیں۔ یہی حال دنیاوی اسباب کا ہے۔ مال و اسباب کی حیثیت اعضاء و جوارح کی ہے۔ جن سے اگر اللہ توفیق دے تو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن اگر اسے منظور نہ ہو تو یہ سب چیزیں نہ صرف بالکل بے فائدہ بن جائیں بلکہ بسا اوقات انسان کے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ ان حالات میں اُس شخص سے زیادہ بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے جو قوت و طاقت کے اصل منبع اور مبدا کو چھوڑ کر محض آلات کو اصل اور حقیقی قوت سمجھنے لگے؟